جلد04، شمارہ01، جون2023

بانو قدسیہ کے ڈراموں میں معاشرت کی عکاسی

Depiction of Society in the dramas of Bano Qudsiya

Rabia Khan
M.Phil Scholar, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

Bazghah Qandeel
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Women University, Faisalabad.

رابعہ خان
ایم فل سکالر، شعبۂ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد
بازغہ قندیل
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

Abstract: Bano Qudsiya was a great Urdu writer in contemporary times. Her works are a treasure trove of Urdu literature, which communicates with readers and introduces them to the purpose of life. Her works are a symbol of beauty of Urdu language. In her dramas he possessed creative powers, which was sensitive and opinioned. She used to observe the circumstances and events around her very closely and then learned the art of presenting them to her readers in a very beautiful pattern. Her characters are belonged to our surrounding. She presented the true picture of our society in her short stories as well in her dramas.

Key words: Society, Common people, Depiction

p ISSN: 2789-4169

e ISSN :2789-6331

Received: 31-5-2023

Accepted:

Online:

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

بانو قدسیہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے اردو ادب میں خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہیں۔ انھوں نے ادب کی متنوع جہات پر قلم اُٹھایا۔ اس لیے خاص کر ان کے تخلیق کردہ ٹیلی، سٹیج اور ریڈیائی ڈرامے ان سے فن حُسن و تازگی نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے ڈرامے سچائیوں کا مرقّع ہونے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھوں نے عام زندگی میں انسانوں کو پیش آنے والے مسائل اور الجھنوں کا وسیع مطالعہ کر کے ان کی گرہیں بھی اپنے کرداروں کے ذریعے ہی کھولی ہیں۔

بانو قدسیہ کے کردار معاشرے میں انسانوں کی خود غرضی، نسلی تفاخر، جذبۂ شوق، طبقاتی اونچ، نیچ، عزت و غیرت، انانیت، عائلی زندگی، جذبۂ نفرت و انتقام اور مجبوریوں کا نہ صرف سامنا کرتے ہیں بلکہ بڑی حوصلہ مندی سے انہیں برداشت کرتے ہوئے ان کے حل کی تلاش میں بھی سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بشریٰ جبیں راٹھور لکھتی ہیں:

> "ڈرامہ میں بانو قدسیہ کا نام اہم ہے۔ وہ ڈرامے میں حالات و مسائل کو کرداروں کی معانت سے تجزباتی عمل سے گزارتی اور نتیجے کی جانب ناظر کو لے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔۔۔ ان کے ڈراموں میں ان کی اپنی فکر مسائل سے دست بگریباں رہتی ہے۔"(1)

معاشرے کے ہر دو چند رکن کی حیثیت سے ان کے کردار بطور مرد و عورت کہیں اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے پیش آنے والے مصائب کا جواں مردی سے مقابلہ کرتے اور معاشرتی جبریت کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور کہیں پر قسمت کے ہاتھوں بے بس و مجبور ہو کر کبھی موت کے شکنجے میں آجاتے ہیں اور کبھی زندہ رہتے ہوئے موت سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ بانو قدسیہ کے ڈرامہ "جنگل کی آگ" میں فاطمہ ایک ایسی بہو کے رُوپ میں سامنے آتی ہے جو ظالم ساس کی ستائی ہوئی ہے۔ بیس سالہ یہ نازک لڑکی زندگی سے بھرپُور اور محبت اور شرم و حیا کا پیکر ہے۔ یہ اپنے شوہر سے اس قدر پیار کرتی ہے کہ اپنے شوہر کو معمولی بخار میں بھی اکیلا نہیں چھوڑتی مگر دوسری طرف اس کی ساس زہر دل میں لیے ہوئے اس سے اپنی بہن کی موت کا بدلہ لینا چاہتی ہے کیونکہ فاطمہ، ذکیہ کی بہن کے سسرال والوں کی بیٹی ہے۔ بہن کی طلاق اور اس کی موت کا غم و غصہ ذکیہ کے دل میں چنگاری کی مانند سلگتا رہا جو بالآخر ایک ایسا الاؤ بن جاتا ہے جو فاطمہ کو جلا کر بھسم کر گیا اور طلاق کی راکھ کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ اس کی ساس فاطمہ کے شوہر سے کہتی ہے:

> "اماں: میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی، نصیر
> یہ کام آج شام سے پہلے پہلے ہو جانا ہے۔۔۔
> آج رات کی ٹرین سے فاطمہ ملتان جائے گی اور طلاق اس کے ہاتھ میں ہو گی۔۔۔"(2)

بانو قدسیہ نے اس سماجی مسئلے کو بیان کیا ہے جو منفی سوچ کی وجہ سے پروان چڑھتا ہے۔ فاطمہ جیسے معصوم انسان اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کر پاتے اور چپ کی چادر تلے زندگی گزارتے ہیں۔ ویرانیاں اور تباہیاں ہر لمحہ ان کو ختم کرتی رہتی ہیں۔

بعض اوقات وقت اور حالات انسان کو ایسے ایسے اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ جو اس کو کسی کے سامنے سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں چھوڑتے۔ ڈرامہ "پہلی چوری" میں علی ہر طرح سے محنتی ہونے کے باوجود بھی تین سال سے بے روزگار گھر بیٹھا ہے۔ اس نے نوکری کے لیے جگہ جگہ درخواستیں بھی دیں لیکن مایوسی اس کا مقدر ٹھہری۔ اسی مایوسی کے عالم میں پیروں فقیروں تک پہنچتا ہے اور موت کو بھی گلے لگانے سے نہیں ڈرتا اور کہتا ہے:

"علی: چلو یہ اچھا ہے تین سال سے بیکار پھر رہا ہوں، عزت سے مروں گا۔۔۔ گولی ماری سینے میں۔۔۔ بیڑا پار۔۔۔"(3)

یہ ایک محبت کرنے والا باپ اور ذمہ دار شوہر ہے۔ اس کا بیٹا عدنان بیمار ہونے کی وجہ سے موت کے کنارے کھڑا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بچے کے علاج کے لیے اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کوئی اسے مالی امداد بھی فراہم نہیں کرتا۔ اس مشکل گھڑی سے نکلنے کے لیے اس کے پاس ایک ہی آخری راستہ بچتا ہے اور ایک دکان سے پچاس ہزار چوری کر لیتا ہے کیونکہ اس پر باپ کی شفقت غالب آجاتی ہے پھر ہمیشہ کے لیے روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کردار کے توسط سے بانو قدسیہ نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ آج معاشرہ اس قدر بے رحم اور سفاک ہو چکا ہے کہ لوگ کسی کے برے حالات میں کام نہیں آتے جبکہ دوسرے جانب صلاحیتوں کو پرکھے بغیر نوکری سے انکار کر دیا جاتا ہے تو وہ ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کسی بھی حد تک جاتا ہے۔ یہ وہ سطح ہوتی ہے جہاں یہ سمجھنا ضروری نہیں رہتا کہ یہ ذریعہ جائز ہے یا ناجائز۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہمارے معاشرے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق ماحول رائج ہے اور نام نہاد با اثر افراد اپنی طاقت کے بل بوتے پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ "دیے کی آنکھ" میں بشیر ایسی ہی لاٹھی کی زد میں آیا ہوا فرد ہے۔ یہ گاؤں میں ماں کے ساتھ رہنے والا سادہ دل انسان کھیتوں میں بیلدار ہے۔ یہ کبھی بھی کھیتوں کو پانی دینے میں کوتاہی یا غیر ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کرتا مگر اس کے ساتھیوں کی کھیتوں کو سیراب کرنے میں ہیرا پھیری کی وجہ سے چودھری حفاظت اور ملک نوازش کے گروہوں میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں چودھریوں کا ایک آدمی مارا جاتا ہے اور بشیر اس قتل کا چشم دید گواہ ہونے کی وجہ سے ملکوں کے خلاف گواہی دینے کا خواہاں ہے مگر ظالم اس کو گواہی سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ملک ان الفاظ میں دھمکی دیتا ہے:

"ملک: اگر رتل میں رہنا ہے تو زبان بند رکھنی پڑے گی، ورنہ واقعی بشیر رتل میں نہیں ہو گا۔۔۔"(4)

اس کے باوجود بشیر ظالموں کے خلاف گواہی دے دیتا ہے اور اگلے ہی دن اس کی لاش کھیتوں میں پڑی ملتی ہے۔ یہ کردار اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ایک کمزور آدمی جب معاشرے کی طاغوتی قوتوں کے خلاف سر اٹھاتا ہے تو اس کو خس و خاشاک کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ یہ دنیاوی خداؤں کے سامنے حق پر ہوتے ہوئے بھی زبان نہیں کھول سکتا۔ ایسوں کو موت کے گھاٹ اتار کر باقیوں کے لیے باعثِ عبرت بنا دیا جاتا ہے۔ یہ معاشرے کے اندھے قانون سے انصاف کی اپیل کرتے کرتے آخر کار ختم ہو جاتا ہے۔

سماج میں پنپنے والے سگے اور سوتیلے کے رجحان نے بھی مشکلات میں اضافہ کیا ہے جس سے رشتوں کی دیواریں کھوکھلی نہیں ہوتیں بلکہ یہ انسانوں کے قتل کا باعث بھی بنتا ہے۔ بانو قدسیہ کے ڈرامے "زرد گلاب" میں جیونی کی ماں کے مرنے کے بعد اس کا باپ دوسری شادی کر کے اس کے سر پر سوتیلی ماں کا عذاب ڈال دیتا ہے۔ جو ابتدا میں جیونی سے اچھا سلوک

رکھتی ہے اور اس کو بتاتی ہے کہ ضروری نہیں کہ باقی سوتیلی ماؤں کی طرح ظالم اور پرائی بن کر رہے گی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ ماں اصل رُوپ میں آجاتی ہے اور چھوٹی سی عمر میں جیونی کو گھر کے پہاڑ جیسے کام سونپ کر خود عیش کرتی ہے۔ اس حد تک تو یہ معمولی بات تھی مگر اس نے سفاکیت کی تمام حدیں اس وقت توڑ دیں جب یہ خود اپنے بھائی کی باتوں میں آکر اٹھارہ سالہ جیونی کی شادی پینتالیس سالہ لالہ رفیق کے ساتھ کر دیتی ہے۔ گویا جیونی کے سوتیلے ماموں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ اپنی بہن سے یوں کہتا ہے:

> "بھائی: تجھے چھوٹی عمر کا ملا تھا؟ اپنے برابر تو بیٹی تھی اس کی۔ اس وقت پار کر دے جیونی کو، ذرا ہوش آئی تو تجھے کاٹ کھائے گی۔ پھر یاد کرنا بھائی کی بات کو۔ ایک ٹوم چھلا تک نہیں مانگ رہا لالہ رفیق۔۔۔ کوئی جوان ملے تو جانے کیا کچھ لے جائے تیرے پاس سے۔۔۔ سانپ کو اور کچھ دیر گود میں بٹھانا ہے تو بٹھا رکھ۔۔۔"(5)

شادی کے بعد اس کو اپنے شوہر کے بچوں کی پرورش کرنی پڑتی ہے۔ شوہر اور اس کے درمیان ایک پیڑی کا فرق ہونے کی بنا پر ذہنی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی۔ اس طرح یہ ساری زندگی سگے اور سوتیلے کی سولی پر لٹکی ایک دن مر جاتی ہے۔ مرتے وقت اس کی رنگت بالکل زرد ہو جاتی ہے۔ یہ کردار ہمارا دھیان معاشرے کی اس کمی کجی کی طرف مبذول کراتا ہے کہ ایک انسان اپنی مثبت سوچ سے جتنا بھی چاہے رشتوں کو فیض پہنچاتا رہے وہ اجتماعیت کے منافقانہ رویے کی بھینٹ چڑھتا رہے گا۔

بحیثیت انسان ہر ایک کو عزت و توقیر کی بھوک ہوتی ہے جو کہ اس کا بنیادی حق بھی ہے مگر اس کو اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی معاشرہ اسے عزت نہیں دیتا۔ بانو قدسیہ کے ڈرامہ "عزت کی گٹھری" میں وفادار سماج کا ایک مضبوط اور توانا کردار ہے۔ یہ اپنے گاؤں سے شہر صرف اس لیے آتا ہے کہ پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بنے تاکہ سب اس کو محترم جانیں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے اپنے اخراجات پورے کرتا ہے اور بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیتا ہے لیکن علم کو باوقار مقام کے حصول کا ذریعہ سمجھنے والے وفادار کی خام خیالی اس وقت دور ہوتی ہے جب وہ بینک کی نوکری کے لیے انٹرویو دینے جاتا ہے تو اس کو احساس کروایا جاتا ہے کہ اس کے پاس اگر کوئی بڑی سفارش یا رشوت نہیں ہے تو اس کی تعلیم بیکار ہے۔ وفادار اپنے دکھ کو اس طرح بیان کرتا ہے:

> "وفا: ادھر۔۔۔ باپ کی زمین سے بے وفائی کیا۔ اماں سے بے وفائی کیا۔۔۔ ادھر کیا ملتا ہے؟ ادھر بھی سب بے وفا سمجھے گا ہم کو۔ بی۔ اے کو کوئی نہیں پوچھتا، اماں وڈی سفارش ہو۔ ماں باپ کی پوزیشن ہو۔۔۔"(6)

اب اس کو سمجھ آتی ہے کہ جس کی جیب بھاری ہے اسی کو سلام کیا جاتا ہے۔ اس ساری صورتحال سے گھبرا کر یہ واپس اپنے گھر چلا جاتا ہے۔ یہ ایسے بے روح معاشرے میں اپنی زندہ لاش کو لے کر نہیں چل سکتا۔ یہ کردار سوسائٹی کے اس کھوکھلے

پن کو نمایاں کرتا ہے کہ اس کے جیسے ناجانے کتنے ہی نوجوانوں کو ذلت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے اور یہ معاشرے کی خستگی پر ایک سوال ہے جس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔

ڈرامہ "دلدل" میں باطنی تصادم کا شکار یاسین ایک ایسا کردار ہے جہاں وہ زیبائش کو قائم رکھنے کے لیے خود کو بھی بیچ دے تب بھی وہ معاشرے کے نام نہاد جھوٹے معیارات کو برقرار رکھنے میں نااہل ثابت ہو گا۔ اس نے پوری زندگی بیسویں گریڈ پر افسری کرتے ہوئے حلال رزق کمایا اور اپنی جمع پونجی سے ایک عالی شان گھر بنواتا ہے بعد ازاں اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا اور پنشن پر اس کی بیوی بچے گزارا نہیں کر سکتے۔ یہ گھر والوں کی طعن و تشنیع سے تنگ آکر جگہ جگہ سے قرض لیتا ہے تا کہ وقتی نمود و نمائش کا بھرم رکھ سکے۔ اس طرح اس پر قرضوں کا ایک انبار لگ جاتا ہے جس کے لیے یہ کوٹھی بیچ کر قرض چکاتا ہے اور دوسری طرف بیٹے کو باہر کے ملک بھیج دیتا ہے مگر بیٹا بھی اس کو منجدھار میں چھوڑ کر واپس نہیں دیکھتا۔ اب ملک یاسین اپنی عزت نفس کے خلاف ایک سیلز مین کی نوکری کرنا چاہتا ہے تا کہ وہ اپنی الجھنوں میں اضافہ نہ کر دے۔ وہ کہتا ہے:

> "ملک: مینیجر صاحب! یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ نے مجھے یہ نوکری نہ دی تو پھر میں اپنے پرسٹیج کے خلاف بہت سے ایسے کام کروں گا جو شاید نہ مجھے پسند آئیں نہ آپ کو۔۔"(7)

یہ کردار اس بات کی علامت ہے کہ آج انسان دکھاوے کا اس قدر قائل ہو چکا ہے کہ حلال و حرام کی تمیز بھول چکا ہے۔ مصنوعی چمک دمک اس کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ ایسی چیزیں افراد کو اندرونی طور پر دیمک کی طرح چاٹتی رہتی ہیں جو مصنوعی معیارات کے گھن چکر میں آکر اپنی ذات کو بھی کھو دیتے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ انمول، بیش قیمت اور پاکیزہ محبت ماں کی ہے جو اپنے بچوں پر بغیر کسی لالچ، حرص، توقع، ریاکاری اور غرض کے ایک گھنے پیڑ کی مانند سایہ کیے رکھتی ہے۔ اسی طرح ایک عورت بطور ایک بیوی اس کا شوہر ہی اس کی کل کائنات ہوتا ہے اگر وہی اس کی ذہنی اذیت کا باعث بن جائے تو عورت گمنام راستوں کی مسافر بن جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک کردار ڈرامہ سیریل "سورج مکھی" میں نرگس کا ہے۔ اس نے عمر بھر شوہر سے کسمپرسی اور مفلوک الحال ہونے کا رونا روئے بنا اس کی خدمت اور بچوں کی پرورش کی اور اس کی تمام محبتیں اور محنت رائیگاں جاتی ہیں جب اس کا شوہر اس پر سوکن لے آتا ہے اور اس کے بچے اس کو بے ثمر اور بوجھ گردانتے ہیں کیونکہ یہ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر ہے۔ ان کو ماں سے زیادہ اپنی فکر ہے اور اسی وجہ سے جب ان کی دوسری ماں ان کو اپنی تنخواہ کے ذریعے اپنا گرویدہ بناتی ہے تو شوہر کی بے وفائی اور بچوں کے سرد مہر روّیے سے تنگ آکر گھر چھوڑ دیتی ہے جس کا رتّی برابر کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ یہ اپنی حالت زار کو یوں بیان کرتی ہے:

> "نرگس: پتہ نہیں مجھے کیوں لگتا ہے کہ فضل نے مجھے چھوڑا ضرور لیکن چھوڑ کر بھی اس نے میری بے عزتی نہیں کی۔۔۔ پر میرے بچوں کو دیکھو بھیا۔۔۔ (رو کر) میں ماں ہوں۔۔۔ زمانے نے اس قدیم پیشے کا کیا کیا، دولت نے اس کی ایسی بے عزتی کی۔۔۔ ماں کو نکال دیا گھر سے، دل سے۔۔۔"(8)

ایک ماں جو گھر گرہستی اور معاشرے کی بنادیں مضبوط کرتی اور بکھرے آشیانے کو تنکا تنکا کر کے جوڑنا جانتی ہے۔ یہ ممتا کے تمام تقاضے پورے کر کے بھی تہی داماں اور دھکے کھانے پر مجبور ہے۔ اولاد جو انسان کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے وہ دنیا داری میں محو ہو کر ماں کو زندہ در گور کر کے نادم اور پریشاں نہیں ہوتی۔ خود غرضی نے ان کا خون سفید کر کے ان کا قبلہ صرف دولت کو ہی متعین کر دیا ہے۔

انسان کبھی کبھی ایسے فیصلے لیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلط ثابت ہو کر انسان کو اپنی کم مائیگی کا احساس دلاتے ہیں۔ ڈرامہ "گھنا جنگل" میں عارفہ اپنے بچوں کی خاطر گاؤں سے شہر اس لیے ہجرت کرتی ہے تا کہ وہ گاؤں کے جاہل وڈیرے بن کر معصوم لوگوں کی زندگی برباد نہ کر دیں۔ اس کا شوہر حسیب ایک زمیندار ہے جو اپنے جانوروں اور زمینوں کے علاوہ کسی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتا۔ عارفہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل، مہذب اور فرض شناس بنانے کے لیے گاؤں چھوڑ دیتی ہے تا کہ وہ سب پڑھ لکھ کر اچھی زندگی گزار سکیں لیکن اس کی اپنی ہی اولاد اس کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔

اس کی بیٹی مانی لڑکوں سے دوستیاں کرنا اور فون پر باتیں کرنا بالکل بھی معیوب نہیں سمجھتی بلکہ ماں کو جامد سوچ اور کنویں کا مینڈک خیال کرتی ہے جبکہ اس کے دونوں بیٹوں کو دولت کی ریل پیل نے آوارہ گرد اور بد تمیز بنا دیا ہے۔ اس سے عارفہ پریشان رہتی ہے کہ یہ سب اس کی سوچ سے الٹ ہو گیا کیونکہ یہ سب اپنی اپنی آرزوؤں کے گرد ایسے چکر لگا رہے ہیں کہ جو بھی اس دائرے کو روکنے کی کوشش کرتا ہے وہ خود چکرا جاتا ہے۔ ایسے میں عارفہ کہتی ہے:

> "عارفہ: بھولی یہ بچے میرے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ کیا کر رہے ہیں میرے ساتھ؟ سب اپنی اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ کسی کو پرواہ نہیں۔۔۔ کوئی نہیں جانتا میرے دل پر کیا گزر رہی ہے۔"(9)

یہ ایک ایسا کردار ہے جو اپنوں کی سرکشی اور بگڑے پن کو ہر حال میں دور کر کے شہری زندگی کے منفی اثرات سے بچانا چاہتی ہے۔ یہ ایسی روشنیوں کے باسی ہیں جہاں دور دور تک اندھیرے ہی ہیں۔ اس کی اولاد ایسے گھنے جنگل میں داخل ہو چکی ہے جہاں اچھائی اور بُرائی میں امتیاز کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ یہ ان کو ایسی پگڈنڈی پر چلنے سے باز رہنے کی ہدایت کرتی ہے جس سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں اور آگے کھائی کی گہرائیاں ان کا مقدر بن سکتی ہیں۔ عارفہ ایک ایسی دلدل میں پھنس چکی ہے کہ وہ اس سے نکلنے کے لیے جتنے زیادہ ہاتھ پاؤں چلاتی ہے اتنی ہی دھنستی چلی جاتی ہے۔ اس کی اولاد اس کے گلے کا کانٹا بن چکی ہے جس کو یہ نگل سکتی ہے اور نہ ہی نکال سکتی ہے۔ اس کی جان ہر وقت اذیتوں کو سہتی ہے۔

سماج میں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور امیر طبقے کے رویوں اور ذہنی برتری غریب طبقے کو ان کی اصلیّت سے دُور جھوٹ کا لبادہ اوڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان میں یہ مزاج امیروں کی وجہ سے اپنی غربت کو چھپانے اور ان کے برابر مال کے حصول کی بے جا خواہش سے جنم لیتا ہے۔ ڈرامہ "اہلِ کرم" کے دو کردار سرفراز اور جاوید کراچی کسٹم میں کلرکی کرتے ہیں اور کچھ دنوں کی چھٹی پر لاہور کے ایک مہنگے ترین ہوٹل میں اپنی محنت سے جمع شدہ رقم لے کر رؤسا کی طرح وقت گزارنے کے

لیے آتے ہیں۔ یہاں پر یہ کسی رئیس زادی کو پھانس کر دولت مند ہونے کے خواب دیکھتے ہیں۔ انہی کی طرح رابعہ اور نزہت کمپنی کے اخراجات پر اسی مقصد کے تحت اسی ہوٹل میں مقیم ہوتی ہیں۔ سرفراز کی رابعہ اور جاوید کی نزہت سے ملاقات کے بعد دونوں اپنے اصل رُوپ کو چھپانے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں جس سے وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ دونوں مرد حضرات سمجھتے ہیں کہ یہ آسودہ حال طبقہ مفلس طبقے کو روند کر ہی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ فخر سے جی سکیں۔ سرفراز جب امیر ہونے کا ناٹک کرنے سے ڈرتا ہے تو جاوید کہتا ہے کہ

> "جاوید:۔۔۔ امیروں کی طرح منہ پھلا کر۔۔۔ اپنے بٹوے سے لوگوں کی عزتیں باندھ کر۔ ساری دنیا کو حقیر سمجھتے ہوئے چل، ظالم جب امیر آدمی کی جیب خالی بھی ہوتی ہے تب بھی اس کے اندر ایک کھل سم سم کا منتر ہوتا ہے۔ دولت کی غار کا دروازہ خود بخود کھلتا ہے اس کے لیے ہر راہ آسان ہو جاتی ہے۔"(10)

یہ دونوں آخر میں پول کھل جانے کے ڈر سے بھاگ جانا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے پاس رقم بھی ختم ہو چکی ہے اور یہ مزید جھوٹ بولنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اصل میں یہ کردار غیر متوازن معاشرے کے خلاف آواز ہیں کہ لاوارث طبقے کو جنم جنم سے احساسِ کمتری میں مبتلا کر کے جگ ہنسائی کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ امرا کی برابری کرنے کی ناکام کوششوں میں اس طرح لگے رہتے ہیں کہ جہاں سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں آخر کار واپس وہاں پر ہی آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مشرقی اقدار و روایات اور تہذیب و تمدن کی امین ایک مشرقی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ یہ اپنی بے شمار خصوصیات یعنی پیار، محبت، ہمدردی، اخوت، جذبۂ قربانی اور وفاداری کی وجہ سے نمایاں تو ہوتی ہے مگر اس کو مرد کی مطلب پرستی اور بے وفائی پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ ڈرامہ سیریل "پیا نام کا دیا" میں ستارہ ایک چھوٹی سی گلوکارہ ہے۔ اس کے سر پر شوہر اور باپ کا سایہ تک نہیں ہے۔ یہ صرف سسرال والوں کے اخراجات پوری کرنے والی مشین ہے۔ یہ اپنے سسر کی پشت پناہی کی وجہ سے شہرت اور ناموری کی بلندیوں کو چھوتی ہے مگر محبت جیسا لطیف جذبہ مفقود ہے۔ اس اثنا اس کی ملاقات اس کے مداح سکندر سے ہوتی ہے۔ گانے کا شوق ان دونوں میں محبت جگا دیتا ہے۔ اس کے بعد ستارہ انڈسٹری میں سکندر کو کام دلواتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سکندر موسیقی کی دنیا کا بے تاج بادشاہ بن جاتا ہے اور اس سے شادی کے بعد ستارہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھریلو عورت بن جاتی ہے اس کے بدلے وہ صرف محبت کی خواہش مند ہے لیکن ستارہ کو جب سکندر کی دوسری عورت میں دلچسپی کا علم ہوتا ہے تو وہ گھر چھوڑ دیتی ہے۔ اب اس کے بعد کوئی گھر بار، رشتہ حتّٰی کہ انڈسٹری بھی نہیں بچتی۔ سکندر کے ہجر میں کافی عرصہ بیمار رہنے کے بعد اپنے دوست افتخار کے کہنے پر واپس گلوکاری کی طرف آتی ہے۔ سکندر ایک بار پھر اس کو راستے کی رکاوٹ سمجھتا ہے کہ وہ ستارہ کے ہوتے ہوئے کبھی بھی چمک نہیں سکتا۔ ستارہ پھر سے اپنی محبت پر کیریئر کو قربان کرتے ہوئے کہتی ہے کہ

> "ستارہ: سکندر (ہاتھ جوڑ کر) تم واپس لے جاؤ، سکندر اور پھر ساری عمر تالا لگا کر رکھنا مجھے۔۔۔ کسی کونے میں ڈال دینا میں کبھی نہیں گاؤں گی سکندر۔"(11)

سکندر کو اس پر رحم نہیں آتا آخر میں ستارہ در در کی ٹھوکریں کھا کر ایک دربار کی مجاور بن جاتی ہے۔ یہ کردار اس معاشرتی المیے کو سامنے لاتا ہے کہ مشرقی عورت مرد کی محبت کی طلب میں شہرت، آزادی اور ترقی لٹا بھی دے تو خود غرض مرد کبھی بھی عورت کو خیرات میں بھی محبت نہیں دیتا۔ یہ رِیت جڑ پکڑ چکی ہے کہ عورت کو ٹشو پیپر سے زیادہ کی وُقعت نہیں دی جاتی اور استعمال کے بعد کوڑا سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ عورت زندگی کے گہرے سمندر میں مرد کی کشتی کے سہارے ساحل تک پہنچ کر منزل پانا چاہتی ہے مگر مرد اس کو غرق کر دیتا ہے۔

بانو قدسیہ نے نہایت چابکدستی سے تمام ڈراموں کے کرداروں کو حقیقت کے جس تناظر میں پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انھوں نے گرد و نواح میں پھیلے بے شمار مسائل، مشکلات اور مصائب کو کرداروں جزئیات سمیت بیان کر کے زندگی کے کتھارسس کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ نے ڈراموں کے ذریعے زندگی کے مختلف مظاہر، مناظر فطرت اور کرداروں کے علاوہ اپنی دانش، دانائی اور فکری گہرائی سے مظاہر کی چھپی ہوئی حقیقت، مظاہر کے پس منظر اور واقعات کی تہہ در تہہ حقیقت کے علاوہ کرداروں کی نئی پرتوں سے متعارف کرایا۔ چوں کہ ہر ادیب اور مصنف معاشرے سے ہی جُڑا ہوتا ہے، وہ ایک حساس انسان کی طرح ان پیچیدگیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ جن مسائل سے انسان ہمیشہ دوچار رہا بانو قدسیہ نے ان کو کرداروں کے ذریعے دکھایا ہے جو زندگی کے گوں ناگوں تجربات کا نچوڑ پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

[1]۔ بشریٰ جبیں راٹھور، اردو زبان وادب (مختلف ادوار میں)، لاہور: سورج پبلشنگ بیورو، 1998ء، ص:359

[2]۔ بانو قدسیہ، جنگل کی آگ، مشمولہ: تماثیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2011ء، ص:266

[3]۔ بانو قدسیہ، پہلی چوری، مشمولہ: پھر اچانک یوں ہوا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2018ء، ص:245

[4]۔ بانو قدسیہ، دیے کی آنکھ، مشمولہ: دوسرا قدم، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء، ص:163

[5]۔ بانو قدسیہ، زرد گلاب، مشمولہ: فٹ پاتھ کی گھاس، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2017ء، ص:129

[6]۔ بانو قدسیہ، عزت کی گٹھری، مشمولہ: حوا کے نام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2015ء، ص:318

[7]۔ بانو قدسیہ، دلدل، مشمولہ: تماثیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2011ء، ص:302

[8]۔ بانو قدسیہ، سورج مکھی، مشمولہ: سورج مکھی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2019ء، ص:80

[9]۔ بانو قدسیہ، گھنا جنگل، مشمولہ: چھوٹا شہر بڑے لوگ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2014ء، ص:284

[10]۔ بانو قدسیہ، اہل کرم، مشمولہ: آدھی بات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2008ء، ص:241

[11]۔ بانو قدسیہ، پیانام کا دیا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2013ء، ص:317

References

1. Bushra Jabeen Rathore, Urdu Zuban o Adab (Mukhtalif adwar main), Lahore: Suraj Publishing Bureau, 1998, pg.359
2. Bano Qudsiya, Jangle ki Aag, Mashmula: Tamaseel, Lahore: Sang e Meel Publications, 2011, pg.266
3. Bano Qudsiya, Pehli Chori, Mashmula: Phir Achanak Yun Hua, Lahore: Sang e Meel Publications, 2018, pg.245
4. Bano Qudsiya, Diya ki Ankh, Mashmula: Dusra Qadam, Lahore: Sang e Meel Publications, 2013, pg.163
5. Bano Qudsiya, Zard Gulab, Mashmula: Footpath ki Ghass, Lahore: Sang e Meel Publications, 2017, pg.129
6. Bano Qudsiya, Izat ki gathri, Mashmula: Hawa k Naam, Lahore: Sang e Meel Publications, 2015, pg.318
7. Bano Qudsiya, Duldul, Mashmula: Tamaseel, Lahore: Sang e Meel Publications, 2011, pg.302
8. Bano Qudsiya, Suraj Mukhi, Mashmula: Suraj Mukhi, Lahore: Sang e Meel Publications, 2019, pg.80
9. Bano Qudsiya, Ghanna Jangle, Mashmula: Chota Shehr Baray Log, Lahore: Sang e Meel Publications, 2014, pg.284
10. Bano Qudsiya, Ahl E Karam, Mashmula: Aadhi Baat, Lahore: Sang e Meel Publications, 2008, pg.241
11. Bano Qudsiya, Piya Naam ka Diya, Lahore: Sang e Meel Publications, 2013, pg.317